ISSN:3007-3324(P) Tashkeel e Jadeed volume:2, Issue:2, January to June 2025
ISSN:3007-3316 (E) Email: tashkeele.jadeed@aiou.edu.pk

علی حسن

ایم فل اسکالر شعبہ اردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور، ای میل:alihassangcu58@gmail.com

ڈاکٹر محمد سعید

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور، ای میل:saeedhafiz786@gmail.com

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں تحسین اردو زبان

Urdu Language Appreciation in the Poetry of Akbar Allahabadi

Abstract: This study delves into the poetic works of Akbar Allahabadi, exploring the appreciation of the Urdu language within them. Akbar Allahabadi has addressed the Urdu language and its issues through diverse methodologies. He articulated that under the dominance of the English language; Urdu can't remain preserved from its influence. Simultaneously, he stated that debates regarding the Urdu-Hindi conflict are futile. However, his stance emphasized that without giving central importance of Urdu language in the system, national progress is not possible. Additionally, he highlighted the deep impact of local languages on the Urdu language and emphasized the elimination of Persian's official status as a reason for these influences. In Akbar's era, Urdu language, due to linguistic deficiencies, distanced itself from meaning, a direct subject of concern for Akbar. He not only articulated the issues of the Urdu language but also made efforts towards their resolution.

Key words: Urdu language, Urdu-Hindi conflict, English dominance & influence, Linguistic deficiencies, Diverse methodologies

اکبر الہ آبادی جس دور میں پیدا ہوئے (خواجہ محمد زکریا کی تحقیق کے مطابق اکتوبر ۱۸۴۵ء(۱)) وہ دور اخلاقی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی زوال کا دور تھا۔۱۸۵۷ء کے بعد جہاں معاشرہ اخلاقی، معاشی، تہذیبی و اقتصادی زوال کی حدوں کو پار کر چکا تھا وہاں پر لسانی زوال بھی در آیا۔ اس کے پیچھے محرک، طاقت، قوت اور حکومت تھی۔ ایک ہزار سال سے مسلمان برصغیر پر حکومت کرتے چلے آئے تھے اور ان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ جب انگریزوں نے اس نظام کو اپنے حصار میں لیا تو سب سے قبل فارسی زبان کا نظام سے خروج اور انگریزی نظام نافذ کرنا لازم ٹھہرا۔ جب انگریزی نظام نافذ ہو چکا تو فارسی کی وہ قدر و قیمت اور اہمیت نہ رہی جو مسلم امرا کے دور میں تھی۔ اس سارے عمل کو سمجھنے کے لیے ۱۸۰۰ء کی ابتدا کے سیاسی اور لسانی منظر نامے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سیاسی حوالے سے دیکھیں تو ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ رچرڈ ولزلی (۱۷۹۸-۱۸۰۵) نے مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی (۱۷۶۰ء-۱۸۰۶ء) سے معاہدہ کیا اور مغلیہ سلطنت کو مرہٹوں سے بچانے کے لیے، اس کے انتظامی معاملات کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحویل میں لے لیا گیا۔ لارڈ لیک کی سربراہی میں کمپنی کی فوج نے مرہٹوں کو شکست دی اور انھیں دہلی سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ستم زدہ بادشاہ نے لارڈ لیک ((۱۸۰۱ء-۱۸۰۶ء) برطانوی ہندوستان میں فوج کا کمانڈر انچیف) کو ۱۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو اپنے حضور شرف باریابی بخشا اور اسے سلطنت کے اعلیٰ ترین خطابات سے بھی نوازا۔ بعد ازاں کمپنی نے لال قلعہ کے انتظامات اور نظم و نسق کی خاطر سیاسی ایجنٹ اور ریزیڈنٹ تعینات کرنا شروع کیے جن کا اصل مقصد مغلیہ انتظامیہ کو کمزور کرنا اور بادشاہ کی جاسوسی تھا۔ انگریز آہستہ آہستہ حکومتی نظام پر حاوی ہوتے جا رہے تھے اور مغل بادشاہوں کی شان و شوکت تباہ ہو چکی تھی مگر ایک ڈراما کھیلا جا رہا تھا، نوبت اسی طرح بجتی تھی اور بادشاہ کی سواری جب لال قلعے سے نکلتی تھی تو توپیں داغی جاتی تھیں۔ اس ڈرامے کے کردار بدلتے رہے اور آخر میں بہادر شاہ ظفر ثانی (۱۸۳۷ء-۱۸۵۷) لال قلعہ کے تخت پر کٹھ پتلی کے روپ میں ملتا ہے، جو انتظامی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا تھا۔ اصل انتظام و انصرام سر چارلس تھیو پلس میٹکاف (۱۸۲۲ء-۱۸۴۵ء ریزیڈنٹ) کے ہاتھ میں تھا۔

۱۸۳۰ کے ہندوستان کو لسانی تناظر میں دیکھیں تو اس وقت چار بڑی زبانیں موجود تھیں۔ پہلی فارسی جو مغلیہ سلطنت کی سرکاری زبان تھی۔ دوسری انگریزی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین بولتے تھے۔ اس کے بعد اردو اور ہندی جو کہ عوامی بول چال کی زبانیں تھیں۔ اس حوالے سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انگریز فارسی کو نظام سے خارج کرنے کی کوشش میں تھے اور جب وہ مغلیہ انتظامیہ پر پوری طرف قابض ہو گئے تو انھوں نے ۱۸۳۷ء میں دیسی زبانوں کو فروغ دینے کے بہانے فارسی کو ہٹا کر اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ اگر اردو کو سرکاری زبان کا درجہ نہ دیا جاتا تو مسلمان فارسی زبان کو نظام سے خارج کرنے پر بھڑک سکتے تھے، یوں انگریزوں نے بغیر کسی ہنگامے کے فارسی کو اس کے اصل مقام و مرتبہ سے گرا کر اس کی حیثیت ختم کر دی۔ دوسری طرف اردو کی ٹکر کے لیے بھی ان کے پاس منصوبہ تھا جس کی ابتدا ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں للو لال جی سے "پریم سبھا" کے نام سے جدید ہندی میں ایک کتاب لکھوا کر ناگری رسم الخط میں شائع کروا کر کر دی تھی۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ۱۸۰۰ء سے قبل بقول ڈاکٹر تاراچند "جدید ہندی کا کہیں کوئی وجود نہ تھا۔"(۲) یعنی اس کی حیثیت ادبی حوالے سے نہ ہونے کے برابر تھی اور اس میں ادبی سرمایہ

موجود ہی نہ تھا۔ یہاں پر ایک اور اہم معاملے کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کا تعلق اسی سیاسی و لسانی ڈرامے سے ہے جو انگریز بغیر کسی ہنگامے کے ہندوستان میں خاموشی سے کھیل رہے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے (۱۸۳۴ء-۱۸۳۸ء) نے تعلیمی پالیسی پیش کی جس میں اس کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان میں جو رقم دیسی زبانوں کی ترقی کے لیے استعمال ہو رہی ہے وہ ختم کر دی جائے اور اس کو انگریزی زبان کی تعلیم پر خرچ کیا جائے تا کہ انگریز کا اصل مقصد "ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کہ اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرز فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطہ نظر سے انگریز" (۳) پورا ہو سکے۔

اس دور میں جہاں سیاسی انفعالیت کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے مغلیہ حکومت کٹھ پتلی بن کر رہ گئی تھی وہاں خارجی جبر سے سمجھوتہ کر لینے کے سبب معاشرے میں وقتی طور پر امن و سکون ہو چلا تھا، جس کی بدولت عالم فاضل لوگوں کو علم و ہنر کی طرف متوجہ ہونے کے بھرپور مواقع ملے۔ کیوں کہ لکھنؤ پہلے ہی کمپنی کے زیر تسلط تھا وہاں علمی و ادبی محافل سجتی تھیں تو دوسری طرف دہلی میں بھی علمی و ادبی محافل سجنے لگیں اور عوامی مشاعرے ہونے لگے۔ اس وقت دونوں دبستانوں (لکھنؤ اور دہلی) میں اردو کی نوک پلک سنوارنے کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ ایک کے روح رواں امام بخش ناسخ (۱۷۷۲ء-۱۸۳۸ء) تو دوسری طرف ابرہیم ذوق (۱۷۹۰ء-۱۸۵۴ء) تھے۔ اکبر کی پیدائش سے قبل لکھنؤ کے پہلوان اور اسلوب پرست شاعر امام بخش ناسخ کی وفات ہو چکی تھی اور اس کے تلامذہ، خیال بندی کے اوہام میں مستغرق تھے۔ شعرا کا یہ گروہ دور از کار تشبیہات، مناسبتیں، رعایت لفظی اور تلازمے تلاش کرنے میں مشغول رہتے ہوئے، خیال بندی کے غیر حقیقی، سطحی احساسات اور زندگی کے بسیط معنوں سے عاری اشعار کو شاعری کا کمال گردانتا تھا۔ سادہ الفاظ میں لکھنؤ کی ادبی فضا پر اسلوب پرستی اور خیال بندی کا سایہ گہرا ہو چلا تھا۔ دوسری طرف دہلی میں شیخ ابرہیم ذوق پورے آب و تاب کے ساتھ سخن کی فضا پر چھائے ہوئے تھے اور ان کی نازک خیالی، تمثیل گری، محاورے، روز مرہ اور عوامی مزاج کی زبان کا سکہ چل رہا تھا۔ ذوق کے عروج کے زمانے کے سخن کی فضا کو دیکھیں تو محاورے، روز مرہ اور لفظ کا خاص استعمال اس دور کا ادبی نعرہ معلوم پڑتا ہے۔ ذوق اور اس کے تلامذہ کے توسط سے محاورے اور روز مرہ میں جدت اور اسے نئے نئے ڈھنگ سے باندھنے کی مشکلیں چل رہی تھیں۔ دونوں دبستانوں میں زبان کی آرائش پر توجہ دی جارہی تھی مگر دونوں کا نکتہ نظر اور دھارا الگ الگ بہہ رہا تھا۔ ناسخ اور اس کے تلامذہ اسلوب پرستی کے تحت فارسیت کو اردو میں غالب اور مقامی الفاظ کو متروک قرار دے رہے تھے مگر ذوق اردو زبان میں دہلی کے اشرافیہ کی بول چال کی زبان کے الفاظ برت کر اردو زبان کو عوامی زبان سے قریب کر رہے تھے۔ اگر اس دور میں دونوں ادبی دبستانوں (دہلی اور لکھنؤ) کو ذوق، ناسخ اور ان کے تلامذہ کی شاعری کے سیاق میں دیکھیں تو پورے منظر نامہ کو لسانی کسرت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

تیسری طرف ایک الگ لسانی منظر نامہ بھی موجود تھا جس میں عام انسان کے مسائل، جذبات و احساسات اور اس کی عمومی زندگی کی عکاسی اسی کی زبان (بولی ٹھولی کی زبان) میں کی جارہی تھی۔ اس کا بنیاد گزار وہ شاعر تھا جو روایت پرستی، آداب اور ضابطوں کو توڑتے اور لسانی بغاوت کرتے ہوئے اردو شاعری کو لوک روایت پر لے آیا تھا۔ یہاں مراد مقامی رنگ اور عوامی روایت کے شاعر نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء-۱۸۳۰ء) سے ہے جو اکبر الہ

آبادی کی پیدائش سے قبل جہانِ فانی سے رخصت ہو چکا تھا مگر اس کی عوامی زبان کی شاعری آدمی نامہ، روٹیاں، روپیہ کا روپ، مفلسی، برسات کی بہاریں، ہولی کی بہاریں، دیوالی، عید، شب برات، بنجارہ نامہ اور ہنس نامہ کی صورت عام عوام کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ دہلی سامراج (۴) اس شاعر کی زبان کو سوقیانہ اور غیر فصیح قرار دیتا ہے مگر اس شاعر کو اکبر الہ آبادی کے دور کے لسانی منظر نامہ میں اس حوالے سے اہمیت ہے کہ اس کی زبان بولی ٹھولی کی زبان ہے، وہی زبان جو اکبر آباد (آگرہ) کی گلیوں میں بولی جاتی تھی۔ یہی اس دور کا سیاسی اور لسانی پس منظر ہے جس میں اکبر الہ آبادی کی پیدائش ہوئی۔ اکبر کو لسان العصر کہا جاتا ہے اس وجہ سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اردو زبان کے متعلق اپنے خیالات کا سخن کی صورت اظہار نہ کرتے۔ ان کے اشعار میں اردو زبان کے متعلق وہی حوالے ملتے ہیں جن کا تعلق اسی سیاسی و لسانی پس منظر سے ہے۔

اس سے پہلے کہ اکبر الہ آبادی کی شاعری کو اردو زبان کی اہمیت کے حوالے سے دیکھیں، یہ ضروری معلوم پڑتا ہے کہ ان کے خطوط کو اسی لینز سے دیکھا جائے۔ اس تجزیے سے نہ صرف اس دور کے سیاسی منظر نامہ کے حوالے سے اکبر کے اردو زبان کے متعلق نظریات و تصورات کو پرکھا جا سکے گا بلکہ اردو زبان کی اہمیت و ستائش کے متعلق اکبر کے اشعار کی بھی بہتر تفہیم ہو سکے گی۔ اکبر الہ آبادی کے دور کے جس سیاسی منظر نامے کو مضمون کے شروع میں موضوع بحث بنایا گیا ہے اس سیاق میں دیکھا جائے تو اکبر الہ آبادی نے اپنے خطوط میں اردو زبان کے متعلق واضح خیالات کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اردو ہندی تنازعے پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان کے متعلق اکبر کے خیالات کے حوالے سے ان کے خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان مکاتیب کا ہے جس میں انھوں نے اردو املا کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور دوسرے حصے میں وہ خطوط ہیں جن میں اردو زبان کے لسانی ڈھانچے اور لسانی بنیادوں پر جاری کشمکش کے متعلق تصورات ہیں۔ نوعیت اول کے خطوط کی تعداد بنسبت نوعیت دوم کے خطوط، زیادہ ہے۔ پہلی قسم کے خطوط (اردو املا کے مسائل اور اکبر کے خیالات) میں عشرت حسین (۵)، احسن مارہروی اور عزیز لکھنوی کو لکھے گئے خطوط اہم ہیں۔ ان میں سے ہمارے موضوع کا تعلق جن خطوط سے براہ راست ہے وہ خطوط وہ ہیں جن میں اکبر الہ آبادی نے لفظ "تمباکو" کی املا کی تحقیق پر لکھے گئے مختلف لوگوں کے مضامین کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کی اہمیت اس حوالے سے بھی ہے کہ ان خطوط میں لسانی ہیئت کی تبدیلی کے متعلق بھی اکبر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ان خطوط میں موجود اکبر الہ آبادی کی آرا کو سامنے لانے سے قبل اس معرکہ نما بحث کا تعارف ضروری ہے۔ لفظ "تنباکو" پر بحث اس وقت شروع ہوئی جب اگست ۱۹۱۰ء میں رسالہ "اصلاح سخن" میں رنجور عظیم آبادی (۱۸۶۳ء-۱۹۲۳ء) نے ایک مضمون میں یہ لکھا کہ لفظ "تنباکو" کی املا "تمباکو" ہے اور جواز یہ پیش کیا کہ "عرب کے اتباع میں ایران نے پنبہ دنبہ شنبہ وغیرہ لکھنا شروع کیا۔ اب ایرانی اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے ہیں اور آم اور تمباک لکھنا شروع کر دیا ہے لہذا ہم لوگ کیوں لکیر کے فقیر بنے رہیں۔" (۶) یہ موضوع اس قدر زیر بحث آیا کہ صاحب قلم لوگوں کے دو حصے بن گئے۔ ایک طرف داغ دہلوی (۱۸۳۱-۱۹۰۵ء) کے شاگرد جو ذوق کی تحریک کے پیش نظر ہندی اور مقامی الفاظ کو سند تسلیم کرتے تھے تو دوسری طرف فارسی

اتباع کرنے والے، جو فارسی الفاظ اور املا کو سند مانتے تھے۔ اکبر کا تعلق دوسرے گروہ سے تھا مگر اس کے باوجود وہ عوامی طریق کو بھی سند کا درجہ دیتے تھے۔ اکبر نے رنجور عظیم آبادی کے مضمون کے متعلق ایک خط میں لکھا کہ "مولوی رنجور صاحب کا استدلال بالکل غلط ہے۔ بلا ثبوت و بلا دلیل انھوں نے جست و خیز کی ہے۔ اب آپ کی تحریر کی قدر ہوتی ہے یعنی آپ نے یہ لکھا تھا کہ فارسی پہلو سے ہم تنبا کو کو قائم رکھیں گے اور ہندی پہلو سے تمبا کو۔"(۷) اکبر الہ آبادی نے اس معرکہ نما بحث کو یوں سمیٹنے کی کوشش کی کہ "اگر کوئی یہ کہتا کہ اب تو لوگ تمبا کو بھی لکھتے ہیں، صحیح ہو یا غلط، رواج بھی ایک سند ہے وہ سچ کہتا۔ جوں جوں فارسی سبق فراموش ہوں گے، اردو خراب ہو گی۔ چالیس پچاس برس بعد یہ اردو نہ رہے گی۔"(۸) ایک اور جگہ عزیز لکھنوی (۱۸۲۱ء-۱۹۱۵ء) کو لکھے گئے خط میں یوں کہا کہ "ترقی کا زمانہ ہے ہر طرف تبدیلی ہو رہی ہے زبان اور املا بھی مستثنیٰ نہیں ہے...... جب بہت لوگ ایک طریق کو اختیار کر لیتے ہیں تو وہ امر بجائے خود ایک سند ہے۔ برف کو اس وقت لاکھوں آدمی بہ صیغہ تذکیر بولتے ہیں لیکن جو تانیث بولتے ہیں ان پر اعتراض نہیں ہے۔"(۹)

ان اقتباسات سے اردو زبان کی املا کے حوالے سے نہ صرف اکبر الہ آبادی کا نظریہ کھل کر سامنے آتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم پڑتا ہے کہ اکبر الہ آبادی اس بات سے غافل نہیں تھے کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان بھی تغیر کے عمل سے گزرتی ہے اور معاشرتی زندگی سے اختلاط کے سبب اس کی ہیئت میں بدلاؤ کا عمل جاری رہتا ہے۔

اب ان خطوط پر بات کرتے ہیں جن میں اکبر الہ آبادی نے اردو ہندی تنازعے کے متعلق اشارے کیے اور ساتھ ساتھ زبان کی ہیئت میں تبدیلی کو بھی موضوع بحث بنایا۔ اکبر کے دور میں لوگ لسانی پیچیدگیوں سے کنارہ کش ہو کر زبان کو صرف ابلاغ کا ذریعہ تصور کرنے لگے تھے۔ اس حوالے سے اکبر نے عزیز لکھنوی کو ایک خط میں یوں لکھا کہ " آپ کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ آج کل کون ان باتوں کو دیکھتا ہے۔ میں خود یہی کہتا ہوں کہ زبان ادائے مطلب کے لیے ہے، جب مطلب معلوم ہو جائے تو پھر نکتہ چینی اسی کی مصداق ہے۔"(۱۰) اردو زبان کے مسائل کے متعلق عزیز لکھنوی ہی کو یوں لکھتے ہیں کہ "میرا یہ بھی خیال ہے کہ کبھی میں وہاں ہوں تو آپ اور چند احباب مل کر بعض مسائل زبان اردو کے متعلق فیصلے صادر کر کے قلمبند کر لیے جائیں، اختلاف تو روز بروز بڑھتا جائے گا، لیکن ہمارے لیے سند ہو جائے گی۔"(۱۱) لسانی حوالے سے دیکھا جائے تو اکبر کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ اردو ہندی تنازعہ تھا۔ مگر اس مسئلے پر اکبر الہ آبادی کے خطوط میں واضح بحثیں نہیں ملتیں، کہیں کہیں مخفی اشارے موجود ہیں جن میں اردو زبان کی حفاظت کے حوالے سے بے عملی کا رویہ اختیار کرنے والوں کا بر سبیل تذکرہ ذکر ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں "اردو زبان کی نسبت عالمگیر شور ہے، لیکن باقاعدہ عمل پر توجہ نہیں معلوم ہوتی"۔(۱۲) اور ایک جگہ مرزا سلطان احمد کو لکھے گئے خط میں اپنی دقتوں کا ذکر کرتے ہوئے "اردو ہندی بحثیں"(۱۳) کا نام لے کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ شاید اس موضوع پر کھل کر بحث نہ کرنے کی وجہ یہ ہو کہ وہ خود انگریزی ملازم تھے اور اردو ہندی تنازعہ بھی انگریزوں کا ہی کھڑا کیا ہوا تھا۔ اس ساری بحث کو اکبر کے ایک خط کے اس اقتباس کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ جب ان سے ان کے خطوط شائع کروانے کے متعلق

بات کی گئی تو انھوں نے یوں کہا" میں نہیں سمجھا کہ خطوط کے چھپنے سے کیا فائدہ۔ میں اہل زبان تو ہوں نہیں اور اس وقت زبان خود معرض تغیر میں ہے۔"(۱۴) یعنی اکبر الہ آبادی کو اس بات کا مکمل ادراک تھا کہ ملکی نظام جس قدر تیزی سے تغیر پذیر ہے اس کے اثرات جہاں معاشرتی زندگی پر پڑیں گے اور اس میں تبدیلیاں ہوں گی وہاں زبان بھی اس تغیر سے گزرتے ہوئے تبدیل ہوتی جائے گی۔ آیئے اب اکبر الہ آبادی کی شاعری میں اردو زبان کے متعلق خیالات کو زیر بحث لاتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے کلیات میں اردو زبان کی اہمیت پر موجود اشعار پر بات کرتے ہوئے سب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اکبر نے اردو زبان کو کتنے پہلوؤں سے دیکھنے کی سعی کی ہے اور اس کے پیچھے کیا محرکات تھے۔ اکبر کے ہاں چار تناظرات کا رنگ گہرا ہے اور تین پہلوؤں پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ اول اردو انگریزی اختلاط، دوم اردو میں ہندی الفاظ کی آمیزش، سوم اردو ہندی آویزش، اور چہارم متفرق خیالات۔ سب سے پہلا منظر نامہ جو اکبر کے ہاں اردو زبان کے حوالے سے ملتا ہے وہ حکومتی تسلط کے سلسلے میں ہے۔ جب انگریز برصغیر پر قابض ہو گیا تو اردو زبان کا انگریزی سے اختلاط ہونا شروع ہوا اور انگریزی الفاظ کو اردو کا جامعہ پہنا کر پیش کیا جانے لگا۔ اس پر اہل زبان کی طرف سے شدید رد عمل کی فضا بننا شروع ہوئی اور اخبارات میں مضامین کا سلسلہ چل نکلا۔ مگر اکبر کا استدلال بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب انگریز کو انتظامی قوت اور ملکی حاکمیت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے تو یہ شکایت کرنا فضول ہے کہ انگریزی اردو زبان میں دخل ہو رہی ہے اور اردو زبان پر سے فارسیت کا رنگ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اکبر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حکمران طبقے کی زبان بھی حاکمیت کا درجہ رکھتی ہے اور جب ایک قوت کو بطور ملکی انتظامیہ تسلیم کر لیا جائے تو اس بات پر بحث کرنا فضول ہے کہ مقامی زبان پر حاکم زبان کا اثر بڑھتا جا رہا ہے اور مقامی زبان کی ہیئت میں تبدیلیاں ہونے لگی ہیں۔ اکبر کا شعر دیکھئے:

ہیٹ ہی کو کر لیا جب قوم کے سر نے قبول

دخل انگریزی پہ اردو کی شکایت ہے فضول (۱۵)

اکبر الہ آبادی کے اس منطق کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ میں جھانکنا پڑے گا۔ یہ سترہویں صدی کا نصف آخر ہے بیجاپور (۱۴۸۹ء-۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ (۱۵۱۸ء-۱۶۸۷ء) بڑے ادبی مراکز کی صورت اختیار کر چکے ہیں دوسری طرف مغلیہ تخت پر بیٹھا اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء) اپنی فوجوں کو دکن کی طرف بھیج چکا ہے۔ اسی دوران دکن میں نئے لسانی شعور کا آغاز ہوتا ہے اور زبان میں تبدیلی ہونا شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ ہندوی کی لسانی روایت کا تسلط برقرار رہتا ہے مگر فارسی زبان کی شعری لغت دھیرے دھیرے دکنی زبان میں سرایت کرنے لگتی ہے۔ اس کے پیچھے محرک اس "مرکز گریز" حکمت عملی کا خاتمہ تھا جس کا آغاز ۱۳۴۷ء میں علاء الدین حسن بہمنی کی بغاوت سے ہوا تھا، اور نئی "مرکز جو" روایت کا آغاز جس کی شروعات بیجاپور (سقوط ۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ (سقوط ۱۶۸۷ء) کے سقوط سے ہوئی۔ اس لسانی تبدیلی کا واضح سراغ وجہی اور غواصی کی غزلوں سے لگایا

جاسکتا ہے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے سقوط اور دلی مرکز کے غلبے کے ساتھ ہی غزل میں دکن کا مقامی لسانی وجود پسپائی اختیار کر گیا اور اس کی جگہ فارسی شعریات کا وجود مسلط ہو گیا اور نوبت یہاں آ پہنچی کہ "دکنی عوام دکنی زبان اور اس کی بندشوں کا مذاق اڑاتے تھے۔"(۱۶) اس مرکز جو روایت سے جو پہلا شاعر بر آمد ہوا اس کی غزل با قاعدہ فارسی شعریات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ یہاں مراد ولی دکنی سے ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمران طبقے کی زبان فارسی تھی اس وجہ سے مقامی زبان پر اس کا اثر پڑنا اور اختلاط ہونا لازم تھا۔

یہی اکبر الہ آبادی کا منطق ہے کہ جب حکومتی سطح پر تبدیلیاں ہوتی ہیں تو ان کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا لازم ہے کہ دکنی (قدیم اردو) اور فارسی کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے قریب تھیں مثلاً رسم الخط، حروف تہجی وغیرہ۔ مگر انگریزی زبان کے ساتھ مسلہ یہ تھا کہ ایسی کوئی مشترکہ خصوصیت موجود نہ تھی جس کی بنیاد پر اہل زبان اس کے اردو زبان سے اختلاط کو فوراً تسلیم کر لیتے۔ اس لیے انگریزی اردو اختلاط پر اہل زبان سخت اختلاف کرتے تھے۔

اکبر کہتے تھے کہ اب حکومت انگریز کے ہاتھ میں ہے اس لیے جوں جوں فارسی سبق فراموش ہوں گے ویسے ویسے زبان میں تبدیلیاں ہوتی جائیں گی۔ فارسی کو سرکاری زبان کے درجے سے ہٹا دیا گیا ہے اور اب انگریزی اس درجے پر فائز ہے۔ اس لیے اب وہ اردو موجود نہ رہے گی جو فارسی شعریات سے متعلق تھی۔

سچ کہتے ہیں حضرت کرامت اکبر

رخصت ہوئی فارسی تو اردو بھی گئی(۱۷)

بلکہ اب جو اردو زبان کی ہیئت ہو گی اس میں فارسیت کے بجائے انگریزی الفاظ کا دخل ہو گا اور ایسی ہی زبان کی تاثیر ہو گی جس میں انگریزی الفاظ کی آمیزش ہو گی۔ انگریزی زبان کی بنیاد پر اردو کی نئی شعریات مرتب کی جائیں گی۔ اس لیے وہ اردو زبان کے حوالے سے یہ بیان دیتے ہیں کہ فارسی کے اٹھ جانے اور سرکاری سطح پر انگریزی مسلط ہونے کے سبب، اردو کی وہ اہمیت نہیں رہی جو مغلیہ دورِ حکومت میں تھی۔ اب انگریزی کا دور دورہ ہے اور اردو دوسرے درجہ کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کا برصغیر کی عوام کو یہ نقصان ہوا کہ وہ قوت لسان سے محروم ہو گئی۔ اکبر الہ آبادی کا موقف یہ تھا کہ سرکاری زبان انگریزی ہے، اس لیے اب اسی بات کو ہی اہمیت حاصل ہو گی جو انگریزی زبان میں کی جائے گی، کیونکہ برصغیر کے عوام کی زبان اردو /ہندی ہے جو کہ دوسرے درجے کی زبان ہے اس لیے اس میں وہ طاقت اور شعلہ بیانی نہیں رہے گی جو حکمران طبقے کو دہلا دینے کی قوت رکھتی تھی۔

فارسی اُٹھ گئی اردو کی وہ عزت نہ رہی

ہے زباں منہ میں مگر اسکی وہ قوت نہ رہی(۱۸)

اکبر کے دور میں لوگ ابلاغ کے لیے بے دھڑک انگریزی آمیزش شدہ زبان بولتے تھے جس سے اکبر کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اب عہد رفتہ کے فارسی سبق فراموش ہو چکے اور نئے باب کا آغاز ہو چلا اس لیے زبان بھی نئی ہو گی اور اسباق بھی نئے۔ایک قطعہ دیکھئے جس کا عنوان ہے "آئندہ اردو زبان کا نمونہ"

بابو جی کا وہ بت ہوا نوکر غیر اس کو پیام دیتا ہے

بابو کہتے ہیں وہ نہ جائے گا میرے انڈر میں کام دیتا ہے(۱۹)

انگریز سرکار کے مسلط ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو انگریز کی نقالی میں اس درجہ آگے بڑھ گیا کہ ہندوستان کی ہر چیز خواہ وہ لباس، کھانا اور روایات ہوں یا زبان، تنقید کا نشانہ بناتا اور ہندوستانی ثقافت کو دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی شے قرار دیتا۔اکبر نے اسی منظر نامے کو ایک شعر میں بڑے خوبصورت طریقے سے کھپایا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شوخ محبوب کو مجھ سے یہ توقع ہے کہ میں اس کی مدح سرائی میں اشعار قلم بند کروں۔کیونکہ اسے کہیں سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اردو زبان سستی ہے۔یہاں لفظ سستی بڑا نرالہ ہے۔جس کے بیک وقت معنی کم تر، دوسرے درجے کا اور حقیر کے ہیں۔

بتوں کو مجھ سے توقع ہے مدح کی اکبر

یہ سن لیا ہے کہ اردو زبان سستی ہے(۲۰)

یہ رویہ دراصل اسی روایت کا تسلسل ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جب اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء) کے ہاتھوں بیجاپور اور گولکنڈہ کا سقوط ہوا تو دکنی عوام دکنی زبان، دکنی اصطلاحوں اور بندشوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔یہی رویہ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک نئی صورت میں نظر آتا ہے جب انگریز کے ہاتھوں دلی کا سقوط ہوا اور مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو برصغیر کے عوام ہندوستانی زبانوں کا مذاق اڑانے لگی اور اسے دوسرے درجے کی شے قرار دے کر انگریزی زبان کو معتبر تسلیم کر لیا۔یہ سارا منظر نامہ دیکھ کر اکبر الہ آبادی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نئی تہذیب برصغیر پر قابض ہو چکی ہے اس لیے اس تہذیب کی ہر چیز کو مقدم اور اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے مقامی روایات فراموش کر دی جائیں گی اور یہی کچھ زبان کے ساتھ بھی ہو گا۔جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا انگریزی اختلاط کی بدولت اردو زبان کی ہیئت تبدیل ہوتی جائے گی۔فارسی کے الفاظ آہستہ آہستہ متروک قرار پائیں گے

اور انگریزی الفاظ کو اپنا لیا جائے گا۔ ولی دکنی، میر، درد، ناسخ، آتش اور غالب وغیرہ کی اصطلاحوں سے نئی اختلاط شدہ زبان اور آنے والی نسلیں دونوں ناآشنا ہوں گی اور ایک وقت وہ آئے گا جب رسم الخط بھی تبدیل ہو کر انگریزی لبادہ اوڑھ لے گا۔

یہ موجود طریقے راہِ ملک عدم ہوں گے نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نہ پیدا ہو گی خطِ نسخ سے شانِ ادب پیدا آ گئیں نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیب رقم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہو گی لغاتِ مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے (۲۱)

یہ رویہ اکبر کے دور میں پنپ چکا تھا اور نئی نسل اردو زبان سے دور ہونا شروع ہو گئی تھی۔ حال تو یہ تھا کہ وہ اردو کے بنیادی الفاظ کو بھی سمجھنے سے قاصر ہو چکے تھے۔ ایسا ہی ایک نقشہ اکبر نے اپنے ایک شعر میں کھینچا ہے۔ شاعر محبوب کی چال ڈھال کو دیکھ کر جملہ کہتا ہے کہ میرے محبوب کی ادا میں بڑا نرالہ اور انوکھا پن ہے جس پر نا صرف محبوب ہنستا ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ اس کا مفہوم میری سمجھ سے باہر ہے۔

کہا جو میں نے کہ ان کی ادا انوکھی ہے

کہا بتوں نے کہ اردو میاں کی چوکھی ہے (۲۲)

اس شعر میں دونوں اشارے موجود ہیں یعنی ایک طرف مقامی زبان کو دوسرے درجے کی شے قرار دے کر اس کا مذاق اڑانے کا رویہ اور دوسرا اُردو زبان سے ناآشنائی۔ اس ناآشنائی کا محرک وہی ہے جس کے متعلق اکبر نے کہا ہے کہ لغاتِ مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے۔ یعنی انگریزی زبان اردو میں اس قدر سرایت کر جائے گی کہ اردو کے فارسی آمیز الفاظ سن کر ایسا محسوس ہو گا کہ یہ اردو زبان کے الفاظ نہیں بلکہ کسی غیر زبان سے اٹھائے گئے ہیں۔

مسلمان قوم قریباً ایک ہزار سال سے برصغیر پر حکومت کرتی آ رہی تھی۔ چاہے وہ غیر ملکی حملہ آور کی صورت ہندوستان پر وارد ہوئی تھی مگر اتنا طویل عرصہ ہندوستانی فضا میں رہتے ہوئے ہندوستانی رنگ میں رنگ چکی تھی۔ ۱۸۰۰ء سے قبل تک اس کے پاس اپنی حکومت، سیاست، ثقافت اور معاشرت تھی مگر ۱۸۰۰ء کے بعد سے مسلسل زوال کا شکار ہو کر ہر میدان میں گراوٹ کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور سقوط دلی کے بعد یہ قوم نا صرف حکومتی سطح پر دوسرے درجے کی قوم قرار پائی بلکہ ہر لحاظ سے درجہ دوم اختیار کرتی چلی گئی۔ چاہے وہ انتظامی میدان ہو یا سیاسی، اخلاقی اقدار ہوں یا مذہبی تصورات ہر چیز میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ درجہ اول کے لوگ انگریزی تہذیب سے اس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ مذہب، زبان اور ہندوستانی اقدار ان کے لیے فرسودہ روایات بن کر کہیں پیچھے رہ گئیں اور وہ انگریز نقالی میں اس قدر مستغرق ہو گئے کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ان کی اپنی

اصلیت کیا ہے۔ دوسری طرف نچلے طبقے کے لوگوں کا مسلہ ہی دوسرا تھا، انھیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ملکی سطح پر کیا ہو رہا ہے اور زبان اردو کس حال میں ہے بلکہ ان کا مسلہ پیٹ کی آگ بجھانا تھا۔ اکبر اس منظر نامہ کو یوں پیش کرتے ہیں:

قوم کیسی کس کو اب اردو زباں کی فکر ہے

غم غلط کرنا ہے بس اور آب وناں کی فکر ہے (۲۳)

وہ اشرافیہ جو ہندوستانی اقدار کی اہمیت کو سمجھتی تھی، جاگیریں ضبط ہونے کی بدولت اس قابل نہ تھی کہ اردو زبان کی طرف متوجہ ہو سکے۔ دوسرا طبقہ جو اس قابل تو تھا کہ اردو زبان کے لیے خدمات انجام دینے کی قوت رکھتا تھا، انگریز نقالی کی دھن میں ہندوستانی زبان وادب سے منہ موڑ چکا تھا۔ تیسرا طبقہ اس قابل ہی نہ تھا کہ وہ اردو زبان کے لیے کوئی خدمات سرانجام دے سکتا۔ یعنی بطور مجموعی قوم اپنی اقدار کو بھلا بیٹھی تھی اور اس کے پاس ایسی کوئی صفت باقی نہ تھی جو اس کو یہ احساس دلاتی کہ وہ کتنی مضبوط قوم تھی۔ ملا حضرات کا طبقہ مذہب کو واعظ کی حد تک اپنائے ہوئے اللہ اللہ کرنے تک محدود رہ گیا تھا مگر اس واعظ کی تاثیر عنقا ہو چکی تھی۔ شعرا کا طبقہ اردو زبان کو سینے سے لگائے ہوئے تھا مگر اس کی سرپرستی کے لیے آصف الدولہ (۱۷۷۵ء-۱۷۹۷ء) اور بہادر شاہ ظفر جیسے نواب اور حکمران موجود نہ تھے جو ان کی مالی اعانت کرتے ہوئے اردو زبان کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے۔ اس سارے معاملے کو اکبر یوں دیکھتے ہیں:

پہلے تھا قوم میں سب کچھ مگر اب کچھ نہ رہا   کسی شاعر نے ہے واللہ یہ کیا خوب کہا

شیخ کے پاس ہے اب صرف مصلےٰ باقی   اور میرے پاس ہے اردوئے معلیٰ باقی (۲۴)

اکبر الہ آبادی عوام کے اُردو زبان کے حوالے سے اس رویہ کو دیکھ کر سخت مایوس ہو چکے تھے، انھیں اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نا ہو کہ اردو زبان پر جمود طاری ہو جائے یا کہیں اردو اپنا لسانی ڈھانچہ تبدیل کرتے کرتے انگریزی لبادہ اوڑھ لے۔ کیونکہ ایک طرف اردو ہندی تنازعہ زوروں پر تھا تو دوسری طرف انگریزی الفاظ اردو میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ اس سارے معاملے سے نمٹنے اور اردو کی ترقی کی ایک ہی ترکیب اکبر کو سوجھی کہ اب اردو زبان کی ترقی یوں ہو سکتی ہے کہ جو کوئی بھی بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ بس اردو زبان کے حق میں بولتا جائے تاکہ زبان کے اندر حرکت موجود رہے اور وہ زندگی کی رمق کھونے سے محفوظ رہ سکے۔

ترکیب ہے ترقی اردو کی بس یہ خوب

جو آپ بول سکتے ہیں اب بول ڈالئے (۲۵)

اردو زبان کے حوالے سے اکبر الہ آبادی کے ہاں دوسرا موضوع اردو ہندی آویزش ہے۔ اکبر الہ آبادی کے ہاں اردو ہندی آویزش کے موضوع پر اشعار پر بات کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اردو ہندی تنازعہ کو مختصراً بیان کیا جائے۔ پھر اکبر الہ آبادی کے موقف اور ان کے اشعار کی تفہیم کی جانب بڑھیں گے۔

۱۸۰۰ء سے قبل لفظ "ہندی" ایک جداگانہ زبان کے لیے مستعمل نہیں تھا۔ یہ لفظ زبان کے لیے مخصوص تب ہوا جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے زیر اہتمام للولال جی نے "پریم سبھا"، "سبھاس بلاس"، "راج نیتی"، اور "لطائف ہندی" کے نام سے اردو رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط میں کتب مرتب کیں۔ ان کتابوں میں پہلی دفعہ اہتمام کیا گیا تھا کہ عربی اور فارسی کے مروجہ الفاظ کے بجائے سنسکرت الفاظ کو جگہ دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ وہی اردو زبان جسے "ہندی"، "ہندوستانی" اور "ریختہ" کہا جاتا تھا دیوناگری رسم الخط میں منتقل ہو کر "ہندی" کہلائی جانے لگی جس کا اردو زبان سے الگ، جداگانہ تشخص قائم ہونے لگا۔

اردو زبان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۸۳۷ء میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور ۱۸۳۹ء میں اسے صدر عدالت دیوانی اور نظامت میں بھی سرکاری حیثیت مل گئی۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی ہندو طبقہ اردو کے خلاف ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دلوانے کی کوششیں شروع ہوئیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد یہ کوششیں ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئیں۔ اردو زبان کے خلاف پہلا محاذ بنارس میں کھلا اور رفتہ رفتہ کئی مجلسیں اور کمیٹیاں قائم ہونے لگیں۔ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) "حیاتِ جاوید" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ "ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم ہوئی تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جابجا اس کے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں ہوئیں"۔(۲۶) یہ سب ہو چکنے کے بعد قلمی جنگ شروع ہوئی اور ہندی کی اہمیت، اس کے آغاز و ارتقاء، ہندی الفاظ و محاورات، اردو کی مخالفت اور فارسی رسم الخط کی خامیوں جیسے موضوعات پر مضامین شائع ہونا شروع ہوئے۔ اس قلمی جنگ میں منشی سرودا پرشاد سنڈل، آر جے، بابو راجندر لال مترا اور شیوراج پیش پیش تھے۔ اردو ہندی تنازعے کی بابت سر سید احمد خاں اور منشی سرودا پرشاد سنڈل کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی رہی جس میں سر سید اردو کے حامی اور منشی سرودا پرشاد سنڈل ہندی کے طرف دار تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مضامین کو رد بھی کیا اور جوابا مضامین بھی لکھے۔ اگر ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء کے ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو اردو ہندی تنازعے کے علاوہ کوئی اور ایسا مسلہ نظر نہیں آتا جو اتنی شدت سے زیر بحث رہا ہو۔ اس ساری بحث کا یہی مقصود تھا کہ اکبر الہ آبادی کے اردو ہندی تنازعہ کے متعلق اشعار کو زیر بحث لانے سے قبل اس مسلہ کا پس منظر اور تعارف بیان کر دیا جائے۔ اس تعارف سے اکبر کے اشعار کی تفہیم بہتر طریقے سے ہو سکے گی۔

اوپر اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کیسے اردو ہندی تنازعہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور دونوں اطراف سے مضامین کا سلسلہ چل نکلا۔ اکبر الہ آبادی اس موضوع کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف دونوں اقوام کا زبان کے متعلق مخصوص نکتہ نظر بیان کرتے ہیں بلکہ قلمی جنگ کو بھی موضوع بحث بناتے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع کو یوں بیان کیا کہ مسلمانوں کا موقف تھا کہ اردو کا رسم الخط فارسی و عربی ہونا چاہیے اور الفاظ بھی انھیں زبانوں کے مستعمل ہونے چاہئیں جبکہ ہندو اس بات پر باہم متفق تھے کہ اس کا رسم الخط دیوناگری اور الفاظ بھاشا کے استعمال ہونے چاہئیں۔ دونوں اپنے اپنے موقف کی تائید اور دوسروں کے استدلال کی مخالفت میں مضامین لکھتے اور مختلف اخبارات میں شائع کرواتے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا چلا گیا۔ شعر دیکھیے کہ:

ہم اردو کو عربی کیوں نہ کریں اردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں

بحثوں کے لیے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں (۲۷)

اکبر الہ آبادی کا نام لیتے ہی جو موضوع ذہن میں آتا ہے وہ طنزیہ و مزاحیہ انداز اور ظریفانہ مضامین ہیں۔ ظریفانہ طبیعت کے مالک شاعر کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اردو ہندی تنازعہ پر بات کرتے ہوئے اپنے مخصوص رنگ کو پس پشت ڈال دیتا اور فلسفیانہ مباحث میں الجھ کر موضوع سخن کو کسی دوسری جانب کو موڑ لیتا۔ اپنے طنزیہ و ظریفانہ رنگ کے تحت اکبر الہ آبادی نے اردو ہندی تنازعے کا ایک خوبصورت جواز پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے محبوب کا طرزِ سخن ہندی تھا اور میں ٹھہرا اردو کا شیدائی۔ معاملہ کچھ یوں ہوا کہ وصل کی رات، میں محبوب سے بحث و تکرار کا مرتکب ہوا۔ یہ بحث و تکرار عاشق و معشوق کے درمیان تھی اور اس میں تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ مگر عشق کی تاثیر اس قدر شدید تھی کہ اس کا اثر علم پر ہوا اور معاملہ بڑھتے بڑھتے علمی حلقوں تک جا پہنچا اور وہاں اردو ہندی بحثیں شروع ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے محبوب سے زبان لڑانے کا قصوروار نہ ہوتا تو شاید یہ اردو ہندی مباحث وجود میں نہ آتے۔ وہ اس گھمبیر مسئلے کو ایک عاشق کی کارستانی بتا کر، تبسم میں بدل دیتے ہیں۔

علم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی تخلیے کی بات پبلک کے دلوں میں گڑ گئی

وصل کی شب میں نے اس بت سے لڑائی تھی زباں یہ اثر اس کا ہوا اردو سے ہندی لڑ گئی (۲۸)

اسی موضوع کو وہ ایک دوسری جگہ الگ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اردو ہندی جنگ کے معنی مجھے اس وقت سمجھ آئے جب میں شراب کے جام لنڈھا کر عالم مستی میں مدہوش تھا۔ رندی کے عالم میں مجھے محسوس ہوا کہ اردو ہندی جنگ اصل میں عاشق و معشوق کی ایک دوسرے سے باہم نوک جھوک کا نتیجہ ہے۔ اور بحث و تکرار تبھی ممکن ہے جب عاشق و معشوق ایک دوسرے کے سامنے موجود ہوں۔ یعنی یہ اردو ہندی تنازعہ اصل میں عاشق و معشوق کے وصل کی داستان ہے۔ اگر دونوں ہجر کی راتوں میں تڑپتے رہتے اور وصال نہ ہو پاتا تو اردو ہندی بحثیں وجود میں نہ آتی۔ ایک زبان

کی دوسری زبان سے جنگ میں لطیف بات یہ ہے کہ ہجر کا خزاں گزر گیا اور وصل کی بہار آپہنچی۔ اردو ہندی جنگ اصل میں عاشقوں کے لیے پیغام عید ہے کہ انھیں محبوب کے دیدار کے لیے کسی قسم کی پابندی اور دشواری کا سامنانہ کرنا پڑے گا۔ شعر دیکھئے:

معنے جنگِ اردوو ہندی میں یہ سمجھا بہ عالم رندی

یعنی ہے اس میں لطف وصل بتاں خوب ملکر لڑی زباں سے زباں (۲۹)

اکبر الہ آبادی کے دور میں جہاں قوم سیاسی، اخلاقی اور مالی حوالے سے روبہ زوال تھی وہاں ایک طبقہ وہ بھی موجود تھا جو اپنی قوم کو چھوڑ کر انگریز کا وفادار بن گیا تھا۔ یہ طبقہ اپنے ملک و قوم سے غداری کرتے ہوئے انگریز سے اعزازات و خطابات اور جاگیریں پاتا اور انھیں جاگیروں کو اپنے عوام کے خلاف استعمال کرتا ہوا انگریز اقتدار کو قوت بخشنے کا سبب بنتا۔ اکبر الہ آبادی کو اس بات کا مکمل شعور تھا۔ اردو ہندی تنازعہ شروع ہوا تو فضول اور لاحاصل بحثیں چل نکلیں۔ اکبر الہ آبادی اس بات کو ظرافت کا رنگ دے کر کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی میں اب ترقی کے امکانات باقی نہیں۔ یہ دونوں زبانیں اس موڑ پر پہنچ چکی ہیں کہ جہاں ان کے ذریعے مال و دولت کا حصول مشکل تر ہوتا جائے گا۔ فارسی زبان کے نظام سے خروج کی وجہ سے اردو بھی اصل مقام و مرتبہ سے گر چکی ہے اور اس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو مغلیہ دورِ حکومت میں تھی۔ اس دور میں اردو ہندی مباحث سے کسی قسم کے فائدے کا امکان نہیں۔ اس دور میں سمجھدار اور دانا شخص وہی ہے جس کے پاس پیسہ (Money) ہے۔ یعنی جو ان مباحثوں کو چھوڑ کر انگریز کا طرف دار بن گیا ہے اور اس کی پالیسیوں پر عمل درآمد کروانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ وہ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ اب وہ وقت آن پہنچا کہ اگر آپ کے پاس مال و زر موجود ہے تو آپ صاحب دوست آدمی ہیں۔ اگر آپ کے پاس اس چیز کا فقدان ہے تو پھر یہ امر آپ کے لیے باعثِ تشویش ہونا چاہیے کہ نہ ہی آپ کا کوئی دوست اور نہ ہی طرف دار۔ یہ دور مادیت پرستی کا دور ہے۔ اردو ہندی مباحث میں پڑ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے اسے کار آمد ثابت کریں اور مال و دولت کا حصول ممکن بنائیں۔ اکبر الہ آبادی کا یہ استدلال دراصل اکبر کے دور کا المیہ ہے کہ قوم اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اقدار کو بھول کر لاحاصل مباحث میں مستغرق تھی یا مادیت پرست بن کر دولت کی ہوس کا شکار ہو چکی تھی۔ شعر دیکھئے کہ:

کہاں اردوو ہندی میں زرِ نقد وہی اچھا ہے جو گنتا منی ہے

میرے نزدیک تو بے سود یہ بحث میاں مد م و چنتا منی ہے (۳۰)

۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے سقوط کے ساتھ ہی اردو کا مرکزہ نظر فارسی کی طرف ہوتا گیا اور اس کے باطن سے مقامی پن غائب ہوتا ہوتا اس قدر کم ہو گیا کہ اگر اب دکنی دور کی اردو زبان کو دیکھیں تو اس پر کسی غیر زبان کا شبہ ہوتا ہے۔ یہی عمل دوبارہ دہرایا گیا مگر اس بار اس کا رخ مقامی پن کی طرف تھا۔ ۱۸۳۰ء کے دور میں جھانکیں تو ہمیں شاہ نصیر دہلوی (۱۷۵۶ء-۱۸۳۷ء) اور اس کے تلامذہ ذوق اور منیر دہلوی وغیرہ کے ہاں یہ

تحریک نظر آتی ہے کہ زبان میں مقامی محاورے اور روزمرہ کے الفاظ کو برتا جائے۔ اس عمل کے ساتھ ساتھ فارسی کی سرکاری حیثیت بھی روبہ زوال تھی اور ۱۸۳۷ء میں فارسی سرکاری نظام سے خارج کر دی گئی، جس کا فارسی زبان پر یہ اثر ہوا کہ اس کی وہ شان و شوکت اور مقام و مرتبہ جو مغلیہ دور حکومت میں تھا گہنا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے دہلی دبستان کو دیکھا جائے تو اس کی زبان میں فارسیت کے بجائے مقامی پن زیادہ ہے۔ اس بات کا اکبر الہ آبادی کو شدت سے احساس تھا۔ اس لیے ان کے ہاں "اردو ہندی آمیزش" کے موضوع پر بھی اشعار موجود ہیں۔ پہلے ذیل میں درج شعر دیکھئے پھر اس پر بات کرتے ہیں:

بام اردو چھوڑ کر ہندی کی چھت پر آگئی

سازِ ایچ کو چھوڑ کر پھر اپنی گت پر آگئی (۳۱)

اکبر الہ آبادی کے مذکورہ شعر میں اسی فضا اور پس منظر کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اکبر الہ آبادی کا استدلال یہ ہے کہ اردو زبان کی جنم بھومی ہندوستان تھا اور یہاں ہی وہ پلی بڑھی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ جب وہ دکن پہنچی تو اس کا رشتہ فارسی زبان سے منقطع ہوا اور دکنی سے استوار ہوا۔ یہاں وہ خوب پھلی پھولی مگر جب گولکنڈہ اور بیجاپور کا سقوط ہوا تو اس کا راستہ مقامی پن سے جدا ہوتا ہوا شمالی ہند کے توسط سے فارسی زبان سے جا ملا اور اس میں فارسی مضامین، فارسی اصطلاحیں اور فارسی بندشیں بڑھتی گئیں۔ مگر اس وقت جب انگریز ملک کا حکمران ہے اور فارسی کو دیس نکالا دیا جا چکا ہے، اردو کا رشتہ ایک بار پھر سے مقامی پن سے جڑ گیا ہے۔ شعر میں موجود لفظ "پھر" اس بات کی دلیل ہے۔ اکبر کی تکنیک یہ ہے کہ انھوں نے فارسی الاصل اور سنسکرت کے الفاظ کو شعر میں کھپایا ہے۔ یعنی فارسی کے الفاظ بام (بالاخانہ)، ساز اور سنسکرت کے چھت اور گت (دھن)۔ یہ شعر اک دوسری طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو اردو ہندی تنازعہ کی طرف ہے۔ یعنی اردو کی بام (بالاخانہ) نے اپنا رشتہ اردو سے ختم کر لیا ہے اور ہندی کی چھت بن گئی ہے۔ اب اس کی موسیقی ہندی الاصل ہوگی نہ کے فارسی اور اردو۔

اکبر الہ آبادی چاہے اردو ہندی بحثوں کو فضول خیال کرتے ہوں اور عوام کو وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بحث و مباحثہ کے بجائے عملی کردار ادا کرنے کی ترغیب دیتے ہوں مگر وہ خود اردو زبان کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی تھے۔ شاعر چاہے قوم و ملت سے خود کو الگ کر کے انسانیت کی بات کرے مگر اس کی ذاتی زندگی اور انفرادی عقائد کہیں نا کہیں اپنا اثر ضرور دیکھاتے ہیں۔ اس وجہ سے اکبر کے ہاں اردو زبان کا پلڑا بھاری ہونا ناگزیر تھا۔ اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ ملکی نظام کی ترقی، اردو سے منسوب کیے بغیر متصور بھی کرتے۔ اس وجہ سے ان کا موقف یہ تھا کہ اس ملک کے تمام معاملات اس وقت بہتری کی جانب گامزن ہو سکتے ہیں جب انتظامی زبان اردو ہوگی اور سارا لین دین اردو کے ذریعے سے ہوگا۔ اور جب تک اردو کو ملک گیر سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جاتا تب تک اس ملکی نظام میں بہتری کا خیال کرنا بے کار عمل ہے۔

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں

اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں (۳۲)

اس مضمون کی شروعات میں اس بات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے کہ اکبر الہ آبادی کی پیدائش سے قبل کس طرح اردو شاعری ناشاعری کا سفر کرتی رہی اور اردو زبان لسانی کثرت میں گھری رہی۔ اس موضوع کو اکبر الہ آبادی نے بھی انھیں معنوں میں دیکھا اور اس پر تاسف کا اظہار کیا کہ ہم زبان کے اصل مفہوم کو بھلا کر اسے ابلاغ کے بجائے لسانی کرشمہ سازی کے لیے مخصوص کر بیٹھے ہیں۔ زبان کا اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بات جو آپ کہنا چاہتے ہیں وہ دوسرے شخص یا مخاطب تک پہنچ جائے اور وہ اس کو باآسانی سمجھ سکے۔ مگر اکبر الہ آبادی کے دور کی ہندوستانی فضا میں زبان کا مفہوم نئی تفہیم اختیار کر چکا تھا۔ اہل زبان، زبان کو اپنی علمیت و قابلیت دکھانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اکبر کا استدلال یہ تھا کہ اس وقت تک زبان کی کوئی اہمیت نہیں جب تک اس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ اس کی مثال انھوں نے یوں دی کہ بے معنی زبان یوں ہے جیسے بغیر ستاروں کے آسمان۔ اگر آسمان پر ستارے نہیں ہوں گے تو وہ بے کیفی کا منظر پیش کرے گا اور اس کی طرف دیکھنا جمالیاتی حس کو تسکین نہیں بخشے گا۔ یہی معاملہ زبان کے ساتھ ہے۔ جو آپ کہنا چاہتے ہیں اگر وہ بات دوسرا شخص سمجھ نہیں پاتا تو چاہے آپ کتنے ہی دانشور اور زبان دان کیوں نہ ہوں، آپ کی زبان دانی اور دانشوری ہیچ ہے۔ زبان کا پہلا مقصد ابلاغ ہے، جس کے بغیر زبان محض بے معنی الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا ہی اردو شاعری کے ساتھ ہوا اور وہ اصل جوہر سے محروم ہو کر رہ گئی۔ شعر دیکھیے

دل چھوڑ کر زبان کے پہلو پہ آپڑے ہم لوگ شاعری سے بہت دور جا پڑے

معنی کے ساتھ ہو تو مزہ ہے زبان کا انجم نہ ہوں تو لطف نہیں آسمان کا (۳۳)

شاعر معاشرے کا نباض ہوتا ہے، وہ معاشرتی امراض کی تشخیص کرتا ہے اور ان کو شاعری کی صورت بیان کرتا ہے۔ شاعر کو لیڈر تصور کرنا اور یہ خیال کرنا کہ وہ معاشرتی خامیوں کا حل بھی بتائے گا اور قوم کی رہنمائی بھی کرے گا، بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب مرض کا تعلق زبان سے ہو تو شاعر پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اس کی درست تشخیص کرے بلکہ اس کو حل کرنے میں عملی کردار بھی ادا کرے۔ یہی صورت اکبر الہ آبادی کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ وہ لیڈر نہ تھے کہ اخلاقی و معاشرتی زوال سے قوم کو نکالتے مگر وہ اہل زبان ضرور تھے۔ اس لیے جب انھوں نے دیکھا کہ شاعری کا پھول، معنی کی خوشبو سے عاری ہو چکا ہے تو انھوں نے نہ صرف اس کو موضوع سخن بنایا بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے اس مرض کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ شاید اسے مبالغہ کہا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کے بعض اشعار کو چھوڑ کر، باقی تمام تر شاعری ایسی ہے جس میں ابلاغ کا ابہام موجود

نہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے ہاں ایسی شاعری موجود ہے جو معنی کا رنگ چوکھا کر دیتی ہے اور اس کی تاثیر بڑھا دیتی ہے۔ اس شاعری کو پڑھ کر طبیعت مچل اٹھتی ہے اور طلسم معنی کا ایک جہاں آباد ہو جاتا ہے۔ شعر دیکھیے کہ:

ڈال دے جان معانی میں وہ اردو یہ ہے

کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے(۳۴)

یہ اس دنیا کا دستور اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ تعریف کیے جانے اور کام کی بنیاد پر سراہے جانے کو پسند کرتا ہے۔ شاعر کا تعلق کیونکہ براہ راست قارئین / سامعین سے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے اندر یہ جذبہ قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر اس نکتے کو انیسویں صدی کے نصف اول کے سیاق میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعریف و توصیف کے جذبہ ہی کا اثر تھا کہ مشاعرے کی ثقافت پروان چڑھی، اور مشاعرے میں کامیابی کو حقیقی شاعری کی سند تسلیم کر لیا گیا۔ اکبر الہ آبادی نے اردو زبان کو سخن کے لیے بطور میڈیم چنا، پھر اردو زبان میں در آتی معنی کی قلت کی تشخیص کی اور اسے دور کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے بدلتے لسانی ڈھانچے اور اردو ہندی تنازعے کو موضوع سخن بنایا۔ اس وجہ سے ان کے اندر یہ جذبہ پروان چڑھا کہ جب میں نے اردو کے اتنے حقوق ادا کیے تو اردو زبان کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ میرے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے حق کے لیے وہ بس یہ اپیل کرتے ہیں کہ اہل زبان اگر میرے حق میں دعا کر دیا کریں تو میرا حق مجھے مل جائے گا۔ شعر دیکھیے کہ:

امید ہے دعا کی اہل سخن سے اکبر

میرے حقوق بھی کچھ اردو زبان پر ہیں(۳۵)

المختصر اکبر الہ آبادی نے اردو زبان اور اس کے مسائل کو مختلف طریقوں سے موضوع سخن بنایا ہے۔ ایک طرف انھوں نے اس بات کو بیان کیا کہ انگریز تسلط کے تحت یہ ممکن نہیں کہ اردو زبان انگریزی کے اختلاط سے محفوظ رہ سکے تو دوسری طرف یہ بھی بیان کیا کہ اردو ہندی تنازعہ اور اس کے متعلق بحث و مباحثے فضول ہیں مگر ان کا اپنا موقف یہ تھا کہ ملکی ترقی، اردو کو انتظامی نظام میں مرکزی حیثیت دیے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو زبان پر مقامی زبان کے گہرے اثرات کو بیان کرتے ہوئے، ان اثرات کی وجہ فارسی زبان کے نظام سے خروج کو قرار دیا ہے۔ اکبر کے دور میں اردو زبان جس طرح لسانی کسرت کی بدولت معنی سے دور ہوتی گئی، اکبر کا براہ راست موضوع بنتا ہے۔ اکبر نا صرف زبان کے اس مرض کی تشخیص کرتے ہیں بلکہ خود میدان میں اتر کر اردو کو معنی کی خوشبو عطا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ زکریا، خواجہ محمد، "ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص:۱۳

۲۔ تاراچند، (دی پرابلم آف ہندوستانی) Tara Chand, The Problem of Hindustani (Allahabad: Indian Periodicals Ltd, 1944),p: 32

۳۔ لارڈ میکالے، نظریہ تعلیم کا اساسی تخیل، مترجم عبد الحمید صدیقی (کراچی: ایجوکیشنل پریس، مارچ ۱۹۶۵ء)، ص:۶۹

۴۔ یہ اصطلاح شمس الرحمن فاروقی نے اپنی کتاب "اردو کا ابتدائی زمانہ" میں دہلی کے ان معتبر، روایت پرست اور روایت ساز شعراء کے لیے استعمال کی ہے جو غزل کے دہلوی معیارات پر پورا نہ اترنے والے شاعر کو شاعر تسلیم نہیں کرتے تھے اور ادبی محافل میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ مشمولہ: شمس الرحمن فاروقی، اردو کا ابتدائی زمانہ (کراچی: آج کی کتابیں، 2009ء)، ص:۱۱۹

۵۔ عشرت حسین اکبر الہ آبادی کے فرزند تھے اور لندن میں بغرض حصولِ تعلیم مقیم تھے۔ اکبر الہ آبادی نے کئی خطوط میں انھیں اردو املا کے حوالے سے مفید مشورے دیتے ہوئے ان کی اصلاح کی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم خط مؤرخہ ۴ اپریل ۱۹۰۱ء کو اکبر الہ آبادی کی طرف سے عشرت حسین کو لکھا گیا جس میں لفظ "مرتبان" کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ مشمولہ: اکبر الہ آبادی، مجموعہ مکاتیبِ اکبر، مرتبہ محمد راشد شیخ (کراچی: ادارہ علم و فن، ۲۰۲۱ء)، ص:۶۸

۶۔ مکتوب اکبر الہ آبادی بنام احسن مارہروی، (مرقومہ ۹/ستمبر ۱۹۱۰ء) مقام، الہ آباد، مشمولہ: اکبر الہ آبادی، مجموعہ مکاتیبِ اکبر، مرتبہ محمد راشد شیخ (کراچی: ادارہ علم و فن، ۲۰۲۱ء)، ص:۲۴۳

۷۔ یہ خط اکبر الہ آبادی نے ۲۶ اگست ۱۹۱۰ء کو احسن مارہروی کو لکھا تھا۔ یہاں "اب آپ کی تحریر کی قدر ہوتی ہے" سے اشارہ احسن مارہروی کے مضمون کی طرف ہے۔ مشمولہ: اکبر الہ آبادی، مجموعہ مکاتیبِ اکبر، مرتبہ محمد راشد شیخ (کراچی: ادارہ علم و فن، ۲۰۲۱ء)، ص:۲۴۳

۸۔ مکتوب اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی، (مرقومہ ۲۶/اگست ۱۹۱۰ء) مقام، الہ آباد، مشمولہ: اکبر الہ آبادی، مجموعہ مکاتیبِ اکبر، مرتبہ محمد راشد شیخ (کراچی: ادارہ علم و فن، ۲۰۲۱ء)، ص:۲۵۳

۹۔ مکتوب اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی، مقام، الہ آباد، مشمولہ: مجموعہ مکاتیبِ اکبر، ص:۲۵۵

۱۰۔ مکتوب اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی، (مرقومہ ۳/ فروری ۱۹۱۲ء) مقام، الہ آباد، مشمولہ: مجموعہ مکاتیبِ اکبر، ص:۲۶۲

۱۱۔ مکتوب اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی، (مرقومہ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۱۳ء) مقام، الہ آباد، مشمولہ: مجموعہ مکاتیبِ اکبر، ص:۲۷۰

۱۲۔ مکتوب اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی، (مرقومہ ۱۱/ اپریل ۱۹۱۰ء) مقام، الہ آباد، مشمولہ: مجموعہ مکاتیبِ اکبر، ص:۲۵۰

۱۳۔ "میں صد ھا دقتوں میں پھنسا ہوں، ازاں جملہ نادرستی وقت اور ایک چھوٹے لڑکے کی تربیت و پرورش۔ اردو ہندی کی بحثیں۔" مشمولہ: اکبر الہ آبادی، مجموعہ مکاتیبِ اکبر، مرتبہ محمد راشد شیخ (کراچی: ادارہ علم و فن، ۲۰۲۱ء)، ص:۲۰۹

۱۴۔ مکتوب اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی، (مرقومہ ۲۷/ اکتوبر ۱۹۱۹ء) مقام، الہ آباد، مشمولہ: مجموعہ مکاتیبِ اکبر، ص:۳۰۸

۱۵۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، مرتبہ نارنگ ساقی (دہلی: میڈیا انٹرنیشنل، ۱۹۹۸ء)، ص:۳۲۶

۱۶۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص:۲۱۳

۱۷۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، مرتبہ نارنگ ساقی (دہلی: میڈیا انٹرنیشنل، ۱۹۹۸ء)، ص:۲۴۳

۱۸۔ ایضاً، ص:۵۸

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۶۶

۲۰۔ ایضاً، ص:۴۹۴

۲۱۔ ایضاً، ص:۷۶-۷۷

۲۲۔ ایضاً، ص:۲۶۷

۲۳۔ ایضاً، ص:۳۵۹

۲۴۔ ایضاً، ص:۲۲۸

۲۵۔ ایضاً، ص:۲۶۵

۲۶۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید (نئی دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء)، ص:۱۳۹

۲۷۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، مرتبہ نارنگ ساقی (دہلی: میڈیا انٹرنیشنل، ۱۹۹۸ء)، ص:۴۲۱

۲۸۔ ایضاً، ص:۲۵۹

۲۹۔ ایضاً، ص:۲۶۱

۳۰۔ ایضاً، ص:۵۴۰

۳۱۔ ایضاً، ص:۶۳۲

۳۲۔ ایضاً، ص:۱۵۵

۳۳۔ ایضاً، ص:۲۳۱

۳۴۔ ایضاً، ص:۱۸۱

۳۵۔ ایضاً، ص:۲۸۹

References:

1.Zakaria, Khwaja Muhammad, "Dr. Akbar Allahabadi, A Research and Critical Study", (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2003), p:13

2. Tara Chand, The Problem of Hindustani (Allahabad: Indian Periodicals Ltd, 1944), p: 32

3. Lord Macaulay, The Fundamental Idea of the Theory of Education, translated by Abdul Hamid Siddiqui (Karachi: Educational Press, March 1965), p: 69

4. This term has been used by Shams-ur-Rehman Farooqi in his book "Urdu Ka Abidin Zamana" for those reliable, traditionalist and tradition-forming poets of Delhi who did not recognize poets who did not meet the Dehlvi standards of ghazal as poets and did not allow them to enter literary circles. Contents: Shams-ur-Rehman Farooqi, Urdu Ka Abidin Zamana (Karachi: Aaj Ki Ekali, 2009), p. 119

5. Ishrat Hussain was the son of Akbar Allahabadi and lived in London for the purpose of education. Akbar Allahabadi gave him useful advice regarding Urdu spelling in several letters and corrected him. The most important letter in this

regard was written by Akbar Allahabadi to Ishrat Hussain on April 4, 1901, in which the word "martaban" is made the subject of discussion. Contents: Akbar Allahabadi, Collection of Makatib-e-Akbar, edited by Muhammad Rashid Sheikh (Karachi: Idara Ilm-o-Fun, 2021), p. 68

6. Letter from Akbar Allahabadi to Ahsan Marharvi, (Dated 9/September 1910) Place, Allahabad, Contents: Akbar Allahabadi, Collection of Makatib-e-Akbar, edited by Muhammad Rashid Sheikh (Karachi: Idara Ilm-o-Fun, 2021), p. 243

7. This letter was written by Akbar Allahabadi to Ahsan Marharvi on 26 August 1910. Here, "Now your writing is valued" refers to Ahsan Marharvi's article. Included: Akbar Allahabadi, Collection of Akbar's Writings, by Muhammad Rashid Sheikh (Karachi: Idara Ilm va Fun, 2021), p. 243

8. Letter from Akbar Allahabadi to Aziz Lucknowi, (Dated 26/August 1910) Place, Allahabad, included: Akbar Allahabadi, Collection of Akbar's Writings, by Muhammad Rashid Sheikh (Karachi: Idara Ilm va Fun, 2021), p. 253

9. Letter from Akbar Allahabadi to Aziz Lucknowi, Place, Allahabad, included: Collection of Akbar's Writings, p. 255

10. Letter from Akbar Allahabadi to Aziz Lucknowi, (Dated 3/February 1912) Place, Allahabad, included: Collection of Akbar's Writings, p. 262

11. Letter from Akbar Allahabadi to Aziz Lucknowi, (Dated 14/October 1913) Place, Allahabad, included in: Collection of Makatib-e-Akbar, p. 270

12. Letter from Akbar Allahabad to Aziz Lucknowi, (Dated 11/April 1910) Place, Allahabad, included in: Collection of Makatib-e-Akbar, p. 250

13. "I am caught in a hundred difficulties, including the inaccuracy of time and the upbringing and education of a young boy. Urdu-Hindi discussions." Included: Akbar Allahabadi, Collection of Maktab-e-Akbar, by Muhammad Rashid Sheikh (Karachi: Idara-e-Ilm-o-Fun, 2021), p. 209

14. Letter by Akbar Allahabadi to Aziz Lucknowi, (Dated 27/October 1919) Place, Allahabad, Included: Collection of Maktab-e-Akbar, p. 308

15. Akbar Allahabadi, Kalyat-e-Akbar, by Narang Saqi (Delhi: Media International, 1998), p. 326

16. Dr. Tabassum Kashmiri, History of Urdu Literature from the Beginning to 1857, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2003), p. 213

17. Akbar Allahabadi, Kalyat-e-Akbar, by Narang Saqi (Delhi: Media International, 1998), p. 243

18. Ibid., p. 58

19. Ibid., p. 266

20. Ibid., p:494
21. Ibid., p:76-77
22. Ibid., p:267
23. Ibid., p:359
24. Ibid., p:228
25. Ibid., p:265
26. Altaf Hussain Hali, Hayat-e-Javied (New Delhi: Tarqee-e-Urdu Board, 1979), p:139
27. Akbar Allahabadi, Kulyat-e-Akbar, Barat Narang Saqi (Delhi: Media International, 1998), p:421
28. Ibid., p:259
29. Ibid., p:261
30. Ibid., p:520
31. Ibid., p:632
32. Ibid., p:155
33. Ibid., p:231
34. Ibid., p:181
35. Ibid., p:289